اسلام کے حوالے سے صورتِ حال انتہائی امید افزا ہے۔ از کار رفتہ جامد تصورات ٹوٹ پھوٹ کی زد میں ہیں اور مسلم تاریخ میں پہلی بار اتنے اعتماد کے ساتھ انسانی تعبیرات کے تحلیل و تجزیہ کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ائمہ اربعہ کا مذہبی تصور جو تاریخ کے راستے ہماری فکر میں داخل ہوا اور جسے رفتہ رفتہ تقدیس کا حامل سمجھا جانے لگا آج پہلی بار کھلے عام مباحثے کی میز پر ہے اور یہی حال ان بہت سی فقہی آراء کا ہے جن کے بارے میں اب تک یہ خیال چلا آتا تھا کہ اسے پچھلوں کے اجماع نے ہمیشہ ہمیش کے لیے فیصل کر دیا ہے۔ سچ پوچھیے تو اہل اسلام اس وقت ایک زبردست فکری غلغلے کے جلو میں ہیں۔ گویا اسلام دوبارہ اپنی اصل بنیادوں پر بس اٹھا ہی چاہتا ہے۔

۱۶

کیا اسلام مغرب کی دادرسی کرسکتا ہے؟

بالآخر آفتاب مغرب میں غروب ہو ہی گیا۔ اٹھارویں صدی کے Enlightenment سے مغرب میں حریتِ افکار کی جو دنیا پیدا ہوئی تھی اور جس سے یہ امید پیدا ہو چلی تھی کہ اکرام آدمیت، شخصی آزادی اور انسانی حقوق کی یہ تحریک ایک نئی جنتِ ارضی کے قیام پر منتج ہوگی، حیف صد حیف کہ اس رومانی تحریک کے غبارے سے ہوا نکل چکی ہے۔ بحیثیت ایک نظریہ اور تہذیب اس وقت مغرب پر جانکنی کا عالم طاری ہے۔ اسپنگلر نے مغربی تہذیب کے زوال کے سلسلے میں جو واضح پیش گوئی کی تھی اس سے کہیں پہلے مغرب پر زوال کے آثار ہویدا تھے۔ حریتِ فکری کی وہی تحریک جو کبھی اس کے شاندار مستقبل کی ضمانت سمجھی جاتی تھی اس کے زوال کا سبب بن گئی۔ Enlightenment نے نہ صرف یہ کہ، جیسا کہ Theodor Adorno اور Max Horkheimer کا خیال ہے، ہالوکاسٹ کے لیے نظری جواز فراہم کیا بلکہ اس نے اقدار سے ماورا ایک ایسی خدا بےزاری کو فروغ دیا جس کے بطن سے مسلسل روحانی اور نفسیاتی بحران جنم لیتے رہے ہیں۔

دو عالمی جنگوں میں یورپ کی ایک تہائی آبادی نیست و نابود ہوگئی لیکن اس کے باوجود تحریکِ حریت فکری (Enlightenment) سے اگر حسن ظن برقرار رہا تو اس کی وجہ نئی دنیا امریکہ میں نئے سیاسی شعور کا غلغلہ تھا۔ تب ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پیمبرانہ آواز کو پائن، جیفرسن اور میڈیسن کا قالب مل گیا ہو۔ انسانی آزادی کا یہ نعرہ امریکہ میں جس انداز سے بلند ہوا

اس کی بازگشت عیسائی دنیا سے باہر بھی سنی گئی۔صدیوں سے انسانوں نے ایک کھلے معاشرے کا جو خواب دیکھا تھا ایسا لگتا تھا عظیم امریکی خواب (American Dream) اسی کی تعبیر ہے۔لیکن آج اکیسویں صدی کی ابتدا میں سب کچھ یکسر مختلف لگتا ہے۔ وہی لوگ جو کل تک حریتِ فکر و نظر کے علمبردار تھے انہوں نے گوانتا نامو میں آہنی پنجروں کی ایک ایسی تعذیب گاہ قائم کر ڈالی جہاں اپنے ہی جیسے انسانوں پر بہیمانہ جرائم کو روا رکھا گیا ہے اور یہ سب کچھ مہذب دنیا کے احتجاج کے باوجود برسوں سے جاری ہے۔ یہ صورت حال اس بات پر دال ہے کہ مغرب جس نظریے کا نام تھا اب اس کی موت ہو چکی ہے۔

ہم مسلمان مغرب کے سلسلے میں بیک وقت نفرت اور محبت کے جذبات رکھتے ہیں۔ ہم مغرب کی خدا بیزاری کے سخت ناقد ہیں۔ روایتی حلقوں میں مغرب کو اباحیت پرستی اور جنسی بے راہ روی کی علامت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی ہم مغرب میں فکر کی آزادی اور سب سے بڑھ کر ٹکنالوجی کے کرشموں کو قدر و ہیبت کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں۔ پچھلی چند دہائیوں میں مغرب ان اسلامیوں کے لئے پناہ گاہ بھی ثابت ہوا ہے جو اپنی اپنی حکومتوں کے ظلم و عتاب سے تنگ آ کر ترک وطن پر مجبور ہوئے ہیں۔ جی ہاں! لندنستان صرف مغرب کا تہذیبی قبلہ نہیں ہمارے لیے ایک متبادل دنیا بھی ہے جس کی موت پر یقیناً ہماری آنکھوں کو بھی نمناک ہو جانا چاہئے۔

حیرت تو اس بات پر ہے کہ مغرب کی اس موت کا خود مغرب کے اعلیٰ تہذیبی اور علمی حلقوں میں کچھ زیادہ چرچا نہیں۔ او سولڈ اسپینگلر سے سیموئل ہنٹنگٹن اور فرانسس فوکویاما سے ڈیوڈ کولمن اور پیٹرک بچانن تک مغرب کے زوال پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں ایماندارانہ تجزیہ کم اور مغرب کے اپنے تعمیر کردہ زعم کی کارفرمائی زیادہ نظر آتی ہے۔ بشمول اسپینگلر جو دوسری تہذیبوں کو مغربی تہذیب کی تمہید قرار نہیں دیتے، واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام حضرات دوسری تہذیبوں کے سلسلے میں خاصے ذہنی تحفظات کا شکار ہیں۔ انہیں کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ وہ دوسرے تہذیبی ماڈل سے اکتسابِ فیض کریں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں تمام تحلیل و تجزیے ایک قسم کی مایوسی پر ختم ہو جاتے ہیں اور ہمارے حصے میں تاریخ کے خاتمے کی بشارتِ پُر ملامت کے علاوہ کچھ اور نہیں آتا۔ فوکویاما اور اس قبیل کے دوسرے دانشور جو تاریخ کا ایک سیدھا اور سطحی شعور رکھتے ہیں ان کے لیے یہ سمجھنا کچھ آسان نہیں کہ مغربی اقوام کے علاوہ دوسری قوموں کے بھی کچھ اپنے خواب ہو سکتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت کی غیر معمولی فتح کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دوسری اقوام بھی اس سیاسی نظام کی طالب ہیں یا یہ کہ جمہوریت تاریخ کی آخری منزل ہے۔ گذشتہ چند صدیوں میں انسانوں نے اجتماعی نظام کے جو تجربات کئے ہیں ہو سکتا ہے مغربی جمہوریت ان میں ایک بہتر متبادل ہو لیکن یہ تو ماضی کا فسانہ تھا کہ ہم آج ایک ایسے عہد میں ہیں جسے دراصل مابعد جمہوری عہد کہا جانا چاہیے۔ یہاں جمہوریت نام ہے مختلف قسم کی خباثتوں میں سے کم تر درجے کی خباثت کے انتخاب کا۔ حالیہ برسوں میں مغرب کی شاہراہوں پر عوامی جمہوریت اور سرمایہ دارانہ جمہوریت میں کھلے عام

ٹکراؤ ہوتا رہا ہے۔ اول الذکر کی نمائندگی جنگ مخالف مظاہرین کر رہے تھے تو آخر الذکر کی قیادت جابر جمہوری حکمرانوں کے ہاتھوں میں تھی۔ آمرانہ اور سرمایہ دارانہ جمہوریتوں میں فرد جس احساس بے بسی سے دوچار ہے اس کے باوجود اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ ''ہم اب ایک ایسے مقام پر آپہونچے ہیں جہاں موجودہ دنیا سے مختلف ایک ایسی دنیا کا تصور بھی نہیں کر سکتے جہاں کوئی ایسا واضح راستہ دکھائی نہ دیتا ہو جو مستقبل کو موجودہ بنیادوں پر ہی مزید بہتر اور مستحکم بنا سکے'' بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر، تاریخ کے خاتمے کی دھمکی دیا کرے، تو ایسے مزعوم دانشوروں کے لیے دعائے خیر ہی کی جا سکتی ہے۔

تاریخ کا سفر اپنے اختتام کو تو نہیں پہنچا ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ مغربی تہذیب کی سبقت اور اس کی مقبولیت کا گراف تیزی سے گر رہا ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں مشرق کے حق میں معاشی قوت کا میزانیہ جس تیزی سے بدلتا رہا ہے ایسا لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں بیجنگ اور نئی دہلی کو عالمی دارالحکومت کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ ٹکنالوجی کی منتقلی کے نتیجے میں مغرب پر جو برا وقت آنے والا تھا، جس کے بارے میں اسپینگلر نے ۱۹۳۱ء میں متنبہ کر دیا تھا، وہ گھڑی اب آچکی ہے۔ گو کہ اسپینگلر کی ان پیش گوئیوں کو سرکاری طور پر وہ پذیرائی نہ مل سکی جس کا یہ عظیم دانشور مستحق تھا لیکن آج اس کی تحریریں پیمبرانہ بصیرت کی حامل معلوم ہوتی ہیں:

> (ایشیائی اور افریقی) نسلوں کے بے شمار اور رنگا رنگ ہاتھ جو حرفت وصناعی میں کم نہیں لیکن یہ خاصے سستے دستیاب ہیں، آنے والے دنوں میں سفید فام نسلوں کی معاشی نبیادیں ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔ قلی کی سخت محنت کے مقابلے میں سفید فام مزدوروں کی سہل پسندی بالآخر ان کی تباہی کا سبب بن جائے گی۔ سفید فاموں کی مزدوری فی نفسہ مضحکہ خیز بنتی جا رہی ہے۔ پیداوار کا مرکز ثقل ان سے مستقل دور ہوتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ ایشیائی افریقی نژاد انسانوں کے دلوں میں پہلی جنگ عظیم کے بعد سفید فاموں کا رعب ودبدبہ بھی جاتا رہا۔ سفید فاموں کے ملکوں میں بے روزگاری کا بنیادی سبب یہی ہے۔ یہ محض ایک بحران نہیں بلکہ مکمل تباہی کی ابتداء ہے۔
>
> (*Der Mensch und die Technik*,1931:86)

اصل صورتِ حال اس سے بھی کہیں سنگین ہے جس کی طرف اسپینگلر نے اشارہ کیا ہے۔ ذیل میں ہم ان عناصر کی نشاندہی کریں گے جو مغرب کے نظری تصور میں بنیادی عناصر ترکیبی کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو ہمارے خیال میں رفتہ رفتہ معدوم ہوتے جا رہے ہیں:

(۱) عیسائیت جو کبھی مغرب کی سماجی سیاسی اور علمی زندگی کی بنیاد سمجھی جاتی تھی آج اس کی حیثیت ایک فرسودہ خیال اور متروک نظریے کی ہے۔ لڈوگ فائرباخ (۱۸۰۴-۱۸۷۲) کی مشہور زمانہ کتاب *Das Wesen des Christentums* کی اشاعت نے غور وفکر کے پرانے سانچوں کو توڑ ڈالا۔ اہلِ فکر عیسائیوں کے لیے ایک ایسی کتاب کو الٰہی پیغام کی حیثیت سے قبول کرنا مشکل ہو گیا جو کائنات کا ایک جمودی تصور رکھتی ہو اور جس کی واقفیت دنیا کے صرف تین براعظموں سے ہو۔

آج مغرب میں عیسائیت کی حیثیت ماضی کے ایک فسانہ کی ہے جس نے روحانی زندگی کو ایک مہیب خلا سے دوچار کر رکھا ہے۔ چرچ کی پرشکوہ عمارتیں اپنی بدحالی پر ماتم کناں ہیں اور اس بات پر شاہد کہ لوگوں کی زندگیوں سے کوئی اہم شئے رخصت ہوگئی ہے۔ اہلِ فکر اس تکلیف دہ صورتِ حال کو مابعد عیسائیت کا نام دیتے ہیں۔

(۲) دوسرا تشویش ناک مسئلہ آبادی میں روز افزوں زوال سے متعلق ہے۔ ۱۹۶۰ء میں یوروپی نژاد افراد کی تعداد دنیا کی ایک چوتھائی آبادی پر مشتمل تھی۔ اقوام متحدہ کے ایک اندازے کے مطابق اگر صورتِ حال یہی رہی تو ۲۰۵۰ء تک یوروپی نسل کے لوگ دنیا کی آبادی کا صرف دس فی صد حصہ رہ جائیں گے۔ سفید فام اقوام کی تعداد تیزی سے گھٹ رہی ہے بلکہ اس بات کا اندیشہ پیدا ہو چلا ہے کہ کہیں یہ نسل معدوم نہ ہوجائے۔ بچانن نے اپنی چشم کشا تصنیف مغرب کی موت (The Death of the West) میں اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ گذشتہ چالیس برسوں میں جہاں دنیا کی آبادی دوگنی ہوگئی ہے، یوروپی اقوام (بشمول آسٹریلیائی، امریکی اور کینیڈائی سفید فام) کی آبادی منجمد ہوکر رہ گئی ہے۔ آبادی میں زوال یا انجماد کا یہ رجحان برقرار رہا تو توقع ہے کہ صدی کے نصف تک مزید ۲۳ ملین جرمن پردۂ عدم میں چلے جائیں گے۔ ان کی مجموعی تعداد جو اس وقت ۹۲ ملین ہے سکڑ کر صرف ۵۹ ملین رہ جائے گی۔ ۲۰۰۰ء میں آئس لینڈ سے روس تک یوروپ کے ۴۷ ممالک کی مجموعی آبادی ۷۲۸ ملین تھی جو صدی کے نصف تک سکڑ کر ۶۰۰ ملین ہوجائے گی۔ ڈیوڈ کولمن بھی کچھ اسی طرح کے اعداد وشمار پیش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اکیسویں صدی کے نصف تک ہالینڈ کی ۳۰ فیصد، جرمنی کی ۲۴ فیصد اور برطانیہ کی ۳۶ فیصد آبادی غیر یوروپی اقوام پر مشتمل ہوگی۔ ہنٹنگٹن بھی اس خیال سے پریشان ہیں کہ ۲۰۵۰ء تک امریکہ کی ایک چوتھائی آبادی ہسپانوی باشندوں پر مشتمل ہوگی۔ غیر یوروپی اقوام کی مسلسل بڑھتی تعداد نہ صرف یہ کہ مغرب کو تہذیبی طور پر تحلیل کر رہی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اب یہ نئی آبادی اس بات کے لیے کوشاں ہے کہ وہ مغرب میں اپنے تہذیبی مظاہر کے ساتھ جینے کا سامان کرے۔

مہاجرین کی یہ دوسری نسل جسے اپنے تہذیبی ورثے پر پہلی نسل سے کہیں زیادہ اعتماد ہے مغرب کو اپنی بنیادوں پر ایک نئی شناخت کے ساتھ برتنا چاہتی ہے۔ اور اگر ایسا ہوا تو ان اقدار وتصورات کا کیا ہوگا جو کبھی مغرب کا وصف سمجھے جاتے تھے، جن سے مغرب عبارت تھا۔ کیا غیر سفید فام اقوام، جنہیں صدی کے نصف تک امریکہ میں اکثریت حاصل ہوجانے کی توقع ہے، مغرب کی نمائندہ سمجھی جائیں گی؟ اگر ایسا ہوا تو شاید ہمیں مغرب کی تعریف بدلنی پڑے گی۔ یہ سمجھنا کہ آنے والے دنوں میں سفید فام آبادی کی شرح میں کوئی انقلابی تبدیلی آئے گی خام خیالی ہے۔ اس کا ایک سبب تو social security کا وہ نظام ہے جو بڑھاپے میں پرسکون زندگی کا ضامن ہے۔ لوگ اپنی اولاد پر پیسے خرچ کرنے

اور انہیں بڑھاپے کا سہارا بنانے کے بجائے عہد کہولت کی آسائش گاہوں میں جگہ محفوظ کرانا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ سماجی اور معاشی عوامل بھی خاندانی نظام کے جھمیلوں میں پڑنے سے روکتے ہیں۔ اکثر لوگوں کی نہ تو اتنی تنخواہ ہوتی ہے اور نہ ہی ان کے پاس اتنا وقت اور ایسی سہولت کہ وہ عائلی زندگی کا چیلنج قبول کرسکیں۔ جن مانع حمل ترکیبوں کو کل تک مغرب اپنی ثقافتی برتری کے طور پر پیش کرتا تھا اور جسے دنیا بھر میں مقبول بنانے کے لیے اس نے پروپیگنڈے کا کون سا راستہ اختیار نہیں کیا، افسوس کہ آج وہی ادویات اور ترکیبیں سفید فام نسلوں کے لیے سمِ قاتل بن گئی ہیں۔

(۳) جمہوریت جو کبھی مغربی تہذیب کا طرہ امتیاز سمجھی جاتی تھی آج اس پر نزاع کا عالم طاری ہے۔ اس کی وجہ صرف وہ سیاہ قوانین نہیں جو برطانیہ میں دہشت مخالف ایکٹ اور امریکہ میں حب الوطنی ایکٹ کے ناموں سے نافذ کیے گئے ہیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر ذرائع ابلاغ کا جبری نظام ہے۔ عوامی ذرائع ابلاغ کے تقریباً تمام ہی بڑے ادارے چند سرمایہ داروں کی مٹھی میں ہیں مثلاً NBC CNBC اور MSNBC جنرل الکٹرک کی ملکیت ہیں، ABC پرڈزنی کی اجارہ داری ہے، CNN ٹائم وارنر کا رہین منت ہے اور CBS وائیکوم کا ذیلی ادارہ ہے۔ جب لوگوں کی بصیرت اور بصارت پر چند سرمایہ داروں کی اجارہ داری ہو، اور لوگ وہی کچھ دیکھنے پر مجبور ہوں جو یہ سرمایہ دار دکھانا چاہتے ہوں تو ایسی صورت میں سیاسی قیادت کا غیر موثر ہوجانا فطری ہے۔ افکار و خیالات کی وہ آزاد منڈی جسے جان اسٹوارٹ مِل نے کبھی صحت مند جمہوری معاشرے کا وصف بتایا تھا ایک ایسی دنیا میں ممکن نہیں رہا جہاں چھوٹے اخبارات اور مقامی رسائل کو بڑے اخبارات نے نگل لیا ہو۔ حد تک تو یہ ہے کہ کتابوں کی صنعت و تجارت بھی اب سرمایہ داروں کی مٹھی میں ہے، وہ جس کتاب کو چاہیں best-seller بنادیں اور جس موضوع کو مناسب جانیں دانشوری کے حوالے سے اس پر بحث و مباحثہ کا بازار گرم کردیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ کی اس جگمگاتی دنیا میں فرد کی بصارت سلب ہوکر رہ گئی ہے۔ اس کے لیے مابعد جمہوری عہد میں یہ سمجھنا خاصا مشکل ہورہا ہے کہ لبرل ڈیموکریسی کے علمبردار اپنے سیاہ قوانین کے ذریعہ روحِ جمہوریت کے خاتمے پر کیوں مصر ہیں۔ اور یہ کہ وہ تحفظِ جمہوریت کے نام پر ایسے اقدامات کیوں کررہے ہیں جن کا واضح مطلب جمہوریت کا گلا گھونٹ دینا ہے۔

(۴) ٹکنالوجی اور سرمایہ جس تیزی سے تیسری دنیا کی طرف منتقل ہورہے ہیں یہ بات بھی مغرب کے لئے کم تشویش ناک نہیں۔ بظاہر نیویارک اسٹاک ایکسچیج اب بھی دنیا کا سب سے بڑا اسٹاک ایکسچنج ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ امریکی قوم سالانہ ۷۰۰ بلین ڈالر کی خطیر رقم خرچ کرڈالتی ہے۔ لیکن یہ سب امریکی خوشحالی کا صرف ایک رخ ہے۔ اگر امریکی ہر سال اتنا سرمایہ پیدا نہیں کرتے تو اس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی معیشت اور صنعت کو ایشیائی تاجروں اور ماہرین حرفت

کے ہاتھوں بیچ رہے ہیں۔ حالیہ برسوں میں چین اور ہندوستان میں معیشت کے غیر معمولی نمو کی قیمت بھی امریکہ کو ادا کرنا پڑی ہے جس کے پاس اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ مختلف قسم کی تکنیکی خدمات کے لیے ہندوستان اور چین کے سستے ماہرین پر انحصار کرے۔ انٹرنیٹ نے اگر ایک طرف تکنیکی ماہرین، کلرکوں اور اکاونٹنٹ کی ملازمت غریب ممالک کو منتقل کردی ہے تو دوسری طرف سستی مزدوری بڑے صنعت کاروں کو اس بات پر مجبور کررہی ہے کہ وہ اب نئے صنعتی ادارے چین و ہند جیسے ملکوں میں قائم کریں۔ معیشت کے رنگ وروپ میں یہ تبدیلی آزاد منڈی کے علمبرداروں کے لئے انتہائی تشویش ناک اور دوررس عواقب کی حامل ہے۔ اگر کوئی ملک اپنی پیداواری صلاحیت کو دوسرے ملکوں میں منتقل کرنے پر مجبور ہو اور اگر صنعت وحرفت کی تمام یونٹیں فون کے دوسرے سرے پر غیر ممالک میں قائم ہوگئے ہوں تو خود اس ملک میں کرنے والوں کے لئے کون سا کام رہ جائے گا؟ پھر آخر وہاں کس چیز کی تجارت ہوگی؟ اور یہ صورتِ حال کب تک باقی رہ سکے گی؟ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ صرف چین اور امریکہ کے مابین باہمی تجارت میں امریکہ کو ۱۲۵ بلین ڈالر کا خسارہ ہے اور اسے اپنے قومی سرمائے سے ہر روز تقریباً ۱.۵ بلین ڈالر بیرون ممالک سے حاصل کردہ مختلف قسم کی خدمات (outsourced services) کے عوض ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ ماہرین معیشت مسلسل اس اندیشے کا اظہار کرتے رہے ہیں کہ اگر یہ صورتِ حال جاری رہی تو آنے والے دنوں میں امریکہ اور یوروپی یونین کا شمار غریب ونادار ممالک میں ہونے لگے گا۔ اگر پیداواری صلاحیت اور صنعت وحرفت وخدمات کے سارے شعبے اسی طرح بیرون ممالک منتقل ہوتے رہے تو پھر نیویارک اور شکاگو کی فلک بوس عمارتوں میں لوگوں کے لیے کرنے کو کیا رہ جائے گا؟ پال روبرٹس کا اندازہ ہے کہ سال ۲۰۲۴ء تک امریکہ کا جاہ وحشم ختم ہوجائے گا اور اس کی حیثیت ایک فسانۂ ماضی سے زیادہ نہ ہوگی۔

(۵) جمہوریت کی طرح سرمایہ داری بھی اہلِ مغرب کے لیے ایک عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے جس پر معقول تنقید بھی خلافِ عقل سمجھی جاتی ہے۔ یہ خیال عام ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت کا کوئی متبادل ممکن نہیں۔ ایسا اس لیے بھی کہ پرانے سوشلٹ بھی اب اس نظام کے خوگر ہوتے جارہے ہیں۔ دوسری طرف اسلامی معیشت کے فلک شگاف نعروں کے باوجود اب تک عالم اسلام میں کسی متبادل معاشی نظام کا خاکہ نہیں ابھر سکا ہے۔ لیکن سرمایہ داری کے اس غیر معمولی فروغ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس نظام پر سوالیہ نشان نہیں لگایا جاسکتا یا یہ کہ مستقبل میں اس نظام کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سرمایہ داری کو سب سے بڑا خطرہ خود سرمایہ داری سے ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے جانور کی ہے جو اپنے زندہ رہنے کے لیے خود اپنا ہی جسم کھاتا ہے۔ سرمایہ داری اپنی موجودہ شکل میں ہرگز ہرگز زندہ نہیں رہ سکتی۔ جس زمانے میں کارل مارکس سرمایہ

دارانہ نظام کی تنقید لکھ رہے تھے اس وقت تک ''خالص سرمایہ'' صحیح معنوں میں منقح نہیں ہوا تھا کہ تب کارپوریٹ کیپٹلزم کا دور نہیں تھا۔ انسانی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ اب سرمایہ دار یہ طئے کررہے ہیں کہ ہم کیسے سوچیں، کیسے محسوس کریں اور زندگی جینے کا ہمارا طور طریقہ کیا ہو۔ سرمایہ داروں کی تعمیر کردہ اس دنیا میں ہماری حیثیت اب صرف ایک صارف کی ہے۔ طرفہ یہ ہے کہ بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں اور بے پناہ وسائل کے حامل عالمی ساہوکار ایسے تعلیمی اداروں اور اوقاف کے قیام میں دلچسپی لے رہے ہیں جن کا مقصد بظاہر تو فلاحی نوعیت کا علمی اور تحقیقی کام ہے لیکن فی الواقع ان اداروں کے ذریعہ وہ اپنے اندازِ فکر کو عام کرنا چاہتے ہیں۔ گویا انسانوں کے لئے آزادنہ غور وفکر کا جو تھوڑا بہت امکان پایا جاتا تھا اس پر بھی پہرہ بٹھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مٹی بھر سرمایہ دار جو اس دنیا کے وسائل پر قابض ہوگئے ہیں ان کی دولت میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ ان کی دولت جس قدر بڑھتی جاتی ہے ان کی قوت میں بھی اسی قدر اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ان عالمی ساہوکاروں کا دائرہ اختیار چوں کہ کسی مخصوص ملک کی سرحد سے پرے ہوتا ہے اس لیے کسی احمدی نژاد یا ہوگوشاویز کے بس میں نہیں کہ وہ ان کو لگام دے سکے۔ تو کیا سرمایہ داری کے اس خوفناک دیو کو قابو میں نہیں کیا جاسکتا؟ بظاہر تو یہی لگتا ہے اس لیے کہ اب نہ اس کا کوئی مد مقابل بچا ہے اور نہ ہی ہم اب تک کوئی نظری متبادل تیار کر پائے ہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا، سرمایہ داری خود اپنے آپ کو تباہ کرنے میں مصروف ہے۔ سرمایہ داری اس بات سے عبارت ہے کہ پیداوار میں روز افزوں اضافہ کیا جائے۔ پیداوار جتنی بڑھے گی سرمایہ میں اسی قدر اضافہ ہوگا۔ لیکن اضافے کی بھی تو کوئی حد ہوگی۔ گذشتہ چند دہائیوں میں اس کلیے پر جتنی مستعدی سے عمل ہوا ہے اس کا نتیجہ ہے کہ آج ہم خود کو گوناگوں قسم کے ماحولیاتی مسائل سے دوچار پاتے ہیں۔ موسم کا عدم توازن، توانائی کا بحران، صاف پانی کی قلت اور فطرت اور انسان کے مابین بے شمار ایسے مسائل جن کا احاطہ ہونا ابھی باقی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ سرمایہ داری کا متبادل کیا ہوسکتا ہے البتہ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ مروجہ سرمایہ داری کے دن اب گنے جاچکے ہیں۔

یہ ہے وہ تکلیف دہ صورتِ حال جس سے اس وقت مغرب دوچار ہے۔ مغربی تہذیب جو گذشتہ دوسو سال سے ہم میں سے بہتوں کے لیے منارۂ نور کی مانند رہی ہے کسی آسمانی ہدایت کی پروردہ نہیں تھی۔ بلکہ انسانی عقل نے صدیوں کے سفر میں دانش کی جو اجتماعی پونجی جمع کی تھی اور جس میں جان ومال کا تحفظ، عقیدے کی آزادی، انسانی حقوق، حریتِ فکری اور مسرت کے حصول کو بنیادی اقدار کی حیثیت حاصل تھی اسے ہی کام میں لایا گیا تھا۔ مغربی افکار وتصورات سے ہمارے بنیادی اختلاف کے باوجود ہمارے لیے یہ صورتِ حال انتہائی تکلیف دہ ہے کہ انسانی امیدوں کا ایک جزیرہ جس پر گاہے بگاہے ہم ساکنینِ مشرق بھی پناہ گزیں ہوتے رہے ہیں یوں ہماری آنکھوں کے سامنے ڈوب جائے۔

مغرب کا یہ بحران جس طرح سفید فام انسانوں کے لیے باعثِ اضطراب ہے اسی طرح ہمارے لیے بھی اس میں فکرمندی کا وافر سامان پایا جاتا ہے۔ اگر انسانوں کی کوئی نسل نمو سے محروم یا صفحۂ ہستی سے غائب ہوجائے تو شعوب وقبائل کا فطری نظام متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پائے گا۔ یہ خدائی اسکیم کا حصہ ہے کہ وہ انسانوں کو شعوب وقبائل میں پیدا کرے، سیاہ وسفید، مرد وزن اور اس طرح کی دیگر شناخت اور صلاحیتوں سے متصف کرے۔ خدا نے ہر قوم اور ہر جغرافیائی خطے کو اپنے مخصوص فضل سے نوازا ہے۔ امت وسط یا عالمی امت کی حیثیت سے ہم مسلمانوں پر لازم ہے کہ ہم قومی اور ملی مفادات سے اوپر اٹھ کر عالمی مفادات کو ملحوظ رکھیں۔ اگر مغربی دنیا پر تباہی آئے گی تو اس کے اثرات سے ہم ساکنین مشرق بھی کب بچ پائیں گے؟

تو کیا اس فیصلہ کن گھڑی میں اسلام مغرب کی دادرسائی کے لیے آگے آسکتا ہے؟ ایک مسلمان کی حیثیت سے جو اسلام کو آخری لمحے تک تمام اقوامِ عالم کی مکمل ہدایت کا دین سمجھتا ہو اس کے لیے اس سوال کا جواب نفی میں دینا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ البتہ عام لوگوں کے لیے یہ سمجھنا کچھ آسان نہیں کہ جو امت گذشتہ کئی صدیوں سے خود زوال پذیر ہو جو فی زمانہ دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کا بنیادی ہدف ٹھہرائی گئی ہو اور جس کی تمام توانائی اپنی مدافعت میں صرف ہو کر رہ گئی ہو آخر وہ اتنا بڑا چیلنج کیسے قبول کرسکتی ہے۔ اس طرز فکر کے پیچھے دراصل روایتی فقہی ذہن کی کارفرمائی ہے۔ مسلم علماء جو صدیوں سے دنیا کو دارالاسلام اور دارالکفر میں منقسم دیکھنے کے عادی رہے ہیں، ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہوگا کہ آخر ہمیں دارالاسلام سے باہر اصلاحِ احوال کے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ لیکن ان تمام عملی دشواریوں کے باوجود اسلام کے حوالے سے صورتِ حال انتہائی امید افزا ہے۔ از کار رفتہ جامد تصورات ٹوٹ پھوٹ کی زد میں ہیں اور مسلم تاریخ میں پہلی بار اتنے اعتماد کے ساتھ انسانی تعبیرات کے تحلیل وتجزیہ کی کوشش کی جارہی ہے۔ ائمہ اربعہ کا مذہبی تصور جو تاریخ کے راستے ہماری فکر میں داخل ہوا اور جسے رفتہ رفتہ تقدیس کا حامل سمجھا جانے لگا آج پہلی بار کھلے عام مباحثے کی میز پر ہے اور یہی حال ان بہت سی فقہی آراء کا ہے جن کے بارے میں اب تک یہ خیال چلا آتا تھا کہ اسے پچھلوں کے اجماع نے ہمیشہ ہمیش کے لیے فیصل کردیا ہے۔ سچ پوچھیے تو اہل اسلام اس وقت ایک زبردست فکری غلغلے کے جلو میں ہیں۔ گویا اسلام دوبارہ اپنی اصل بنیادوں پر بس اٹھا ہی چاہتا ہے۔

دریں اثنا مغرب میں مسلم دانشوروں کی ایک نسل فکری بلوغ کے ابتدائی مراحل میں داخل ہوگئی ہے جو مختلف مسلمہ امور کو جنھیں اب تک تقدیس کا درجہ حاصل تھا، دوبارہ بحث وتمحیص کا موضوع بنانا چاہتی ہے۔ گو کہ ان کی فکری اٹھان اسی پرانے فقہی ڈھانچے میں ہوئی ہے لیکن پچھلے چند برسوں میں ان میں سے بعض حضرات کی تحریروں نے اسلام اور مغرب کے مابین نئے پلوں کی تعمیر کا امکان روشن کردیا ہے۔ یہ تحریریں گرچہ مدافعانہ بلکہ بسا اوقات معذرت خواہانہ لب ولہجے کی حامل ہیں جسے یقیناً پیغمبرانہ اسلام کی بلند آہنگی سے کچھ زیادہ علاقہ نہیں البتہ ان کے ذریعے آنے والے دنوں میں کہیں زیادہ گہرائی سے ان امور پر پُر اعتماد

غور وفکر کی راہ ہموار کر سکتی ہے۔ مغرب کے لئے ان تحریروں میں دلچسپی کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہاں پہلی بار مسلمانوں کو مغرب کی تعمیر میں بھر پور شرکت کی نظری اساس فراہم کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک اس قبیل کی کوششوں میں بعض بنیادی فکری خامیاں موجود ہیں۔ اگر ایک طرف مسلم مفکرین اپنی سادہ لوحی میں یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مغربی معاشرے میں ان کی بھر پور شرکت مغرب کا رُخ بدل سکتی ہے تو دوسری طرف اہلِ مغرب اس خوش گمانی میں مبتلا ہیں کہ ان کے زوال پذیر معاشرے میں نئے مسلم خون کی شمولیت ان کی اخلاقی اور روحانی زندگی کا احیاء کر سکتی ہے۔ ہمارے خیال میں ایک ایسی مسلم اقلیت سے جسے نئے ماحول میں ابھی اپنی صحیح قدر و قیمت اور سمت کا اندازہ لگانے میں بھی دقتوں کا سامنا ہو، ایسی توقعات شاید برمحل نہیں۔ اولاً مغرب جس بحران سے دوچار ہے وہ بنیادی طور پر تہذیبی نوعیت کا ہے روحانی نہیں۔ ثانیاً اسلام کو محض ایک روحانی نظام سمجھنا ایک ہمہ گیر دین کو اخلاقی تعلیمات و رسوم میں محدود کر دینا ہوگا جو یقیناً اسلام کی صحیح اور بھر پور تعبیر نہیں ہوگی۔ ایک ایسی تہذیب جہاں اقدار کی دنیا تہ و بالا ہوگئی ہو، جہاں خدا کو بڑی مشکل سے حاشیے پر جگہ ملی ہو، جہاں افزائشِ نسل کے بغیر جنسی زندگی کو انسانی آزادی کی معراج سمجھا جاتا ہو، جہاں جمہوری نظام کو چند سرمایہ داروں نے یرغمال بنا لیا ہو، جہاں سرمایہ داروں کی بے لگام ہوس نے سستی مزدوری کی تلاش میں صنعت و حرفت اور پیداوار کو تیسری دنیا کے ملکوں میں منتقل کر دیا ہو اور جہاں کارپوریٹ کیپٹلزم کو مزید انگیز کئے جانا دنیا کی مکمل تباہی کا شاخسانہ ہو، ایک ایسی تباہ حال تہذیب میں اخلاقی اور روحانی مسلمانوں کی ایک قلیل آبادی کے انضمام سے تہذیب کا بنیادی قالب کیسے بدل سکتا ہے؟

مغرب کا یہ بحران کہیں بہتر توجہ کا طالب ہے۔ اقوامِ مغرب پر یہ بات بہت تیزی سے واضح ہوتی جا رہی ہے کہ دنیا جینے کا یہ انداز انتہائی غیر عاقلانہ بلکہ سراسر مفسدانہ ہے۔ ان میں سے بہتیرے اس حماقت آمیز طرزِ زندگی کو ترک کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ انھیں کوئی متبادل دکھائی نہیں دیتا۔ خود مسلم دنیا سرمایہ دارانہ نظام کا حصّہ بن چکی ہے۔ اب محض خالی خولی تبلیغی کاوشیں نہ تو کسی کو متوجہ کر سکتی ہیں اور نہ ہی ان کے ذریعہ حالات کا رخ موڑا جا سکتا ہے۔ اسلام، مسلمان، مغرب بلکہ تمام اقوامِ عالم کے مستقبل کا انحصار اب اس بات پر ہے کہ آنے والے دنوں میں مسلم علماء و دانشور دنیا کو سرمایہ داری کے شکنجوں سے نجات دلانے کے لئے کیا متبادل پیش کرتے ہیں۔ وحی ربانی کی روشنی میں پیمبرانہ مشن کی تشکیلِ نو کی ضرورت جتنی آج ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔